# حیات اللہ انصاری کی افسانہ نگاری

رفعت مالک

Abstract:

Hayatullah Ansari was an Indian author Journalist and politician. After schooling he joined the Aligarh Muslim University where he got his bachelor's degree. In Aligarh he came in contact with the progressive writer's Movement. He was influenced by then and this is reflected in his short stories which reflect his socialist bent of mind.

He was accepted as a reputable short story writer of Urdu.

حیات اللہ انصاری ترقی پسند افسانہ نگار ہیں۔ جس وقت انھوں نے افسانہ نگاری کا آغاز کیا، ترقی پسند تحریک عروج پر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حیات اللہ انصاری بھی ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے۔ ان کے بہت سے افسانوں میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ترقی پسند سوچ اور فکر کا پرچار ہوا ہے ترقی پسند تحریک کے حامیوں میں حیات اللہ انصاری پیش پیش تھے جس کے باعث ان کے افسانوں میں ترقی پسند تحریک کے اثرات نمایاں ہیں اور بیشتر افسانوں میں ترقی پسند فکر کا برملا اظہار ہوا ہے۔

حیات اللہ انصاری نے چار افسانوی مجموعے قارئین کی نذر کیے:

انوکھی مصیبت کے دیباچہ میں ۱۵/اگست ۱۹۳۸ء کی تاریخ درج ہے جسے حلقۂ ادب لکھنؤ نے شایع کیا جب کہ بہ عنوان بھرے بازار میں کے دیباچہ بہ عنوان ''پہلی بات'' میں ۱۵/اگست ۱۹۳۸ء کی تاریخ درج ہے جسے مکتبہ اردو لاہور نے کتابی شکل دی۔ اب ان دونوں دیباچوں کی رو سے بھرے بازار میں پہلا افسانوی مجموعہ معلوم ہوتا ہے اور ''انوکھی مصیبت'' دوسرا ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے اردو افسانے کی روایت میں انوکھی مصیبت (۱۹۳۸ء) کو پہلا افسانوی مجموعہ خیال کیا ہے۔ ڈاکٹر عزیز فاطمہ بھی انوکھی مصیبت کو پہلا افسانوی مجموعہ، ٹھہراتی ہیں جب کہ شہاب قدوائی بھرے بازار میں ۱۹۳۸ء کو پہلا مجموعہ اور انوکھی مصیبت ۱۹۳۹ء کو دوسرا مجموعہ قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صغیر افراہیم ''انوکھی مصیبت''۱۹۳۹ء جو کتاب دان

لکھنؤ سے شایع ہوئی، کو پہلا افسانہ مجموعہ اور بھرے بازار میں ۱۹۴۶ء کو دوسا افسانوی مجموعہ سمجھتے ہیں اور نافع قدوائی انو کھی مصیبت ۱۹۳۹ء کو پہلا مجموعہ اور بھرے بازار میں ۱۹۴۶ء کو دوسرا افسانوی مجموعہ قرار دیتے ہیں۔

اس ساری بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ''انو کھی مصیبت'' پہلا افسانوی مجموعہ ہے کیوں کہ ''انو کھی مصیبت'' پہلا افسانہ ہے اس کے پیش نظر ''انو کھی مصیبت'' کو پہلا افساجوی مجموعہ تصور کیا جاتا ہے اور ''بھرے بازار میں'' کو دوسرا مجموعہ۔

حیات اللہ انصاری کا تیسرا افسانوی مجموعہ شکستہ کنگورے ہے جس کی تاریخ اشاعت کے حوالے سے مختلف شواہد ملتے ہیں۔ بعض ناقدین کے مطابق ۱۹۵۵ء، بعض کے خیال میں ۱۹۶۴ء سن اشاعت ہے، بعض ۱۹۴۶ء تاریخ اشاعت تصور کرتے ہیں۔ حیات اللہ انصاری کا چوتھا اور آخری افسانوی مجموعہ ٹھکانا ۱۹۹۱ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے شایع کیا۔

تاریخی شواہد کی رُو سے پہلے افسانوی مجموعے انو کھی مصیبت میں پانچ افسانے شامل ہیں اور انتساب ''ق'' کے نام کیا ہے۔ دوسرے افسانوی مجموعے بھرے بازار میں میں پہلے پانچ افسانے وہی ہیں جو انو کھی مصیبت میں شامل تھے۔ علاوہ ازیں چار طنزیہ افسانے اور ایک طویل افسانہ لکھا۔ دو کہانیاں ''میاں خوں خوں'' (بچوں کے لیے)، ''کالا دیوتا'' (بڑے بچوں کے لیے) تحریر کیں۔ حیات اللہ انصاری نے بھرے بازار میں میں دو ڈرامے بھی شامل کیے ''بھوت گھر'' اور ''آپ ہی میاں در دربار آپ ہی میں کھیت کھلیان''۔ کہانیوں کے علاوہ ایک ''قدرت کی بانہوں میں'' بھی شامل ہے۔ حیات اللہ انصاری کے افسانوں کی طرح ان کی کہانیوں، ڈراموں اور سفرنامہ کی اہمیت بھی مسلمہ ہے۔ حیات اللہ انصاری کے افسانوی مجموعے بھرے بازار میں کے افسانوں میں ان کا اسلوب مشاہد، فکر اور حقیقت کا پرتو ہے۔ ان افسانوں میں طنز کی کاٹ اور سفاک حقیقت نگاری کا عنصر غالب ہے۔

حیات اللہ انصاری کے تیسرے افسانوی مجموعے شکستہ کنگورے کے اہم افسانوں میں ''شکر گزار آنکھیں''، ''ماں بیٹا''، ''نیا کھاتا''، ''سلام کہہ دینا''، ''موزوں کا کارخانہ''، ''بارہ برس کے بعد'' اور ''چچا جان'' شامل ہیں۔ ان میں بیشتر افسانے فسادات کے موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں جن میں اُس وقت کی حقیقت نگاری سے کام لیا گیا ہے۔

حیات اللہ انصاری کا چوتھا اور آخری افسانوی مجموعہ ٹھکانا ہے جو تیراہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ ان افسانوں میں جدید موضوعات کے ساتھ ساتھ معاشی اور تہذیبی رویوں کو اظہار ہوا ہے۔ ان میں معاشرتی رویوں کی پاسداری کی گئی ہے۔ حیات اللہ انصاری نے اپنی ترقی پسندانہ سوچ کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے افسانوں کے موضوعات عام انسانی زندگی سے کشید کیے ہیں۔

''انوکھی مصیبت'' مزاحیہ افسانہ ہے جو ضلع کلکٹر احمد موسیٰ اور اس کے چار دوستوں کا قصہ ہے۔ احمد موسیٰ نے

اپنے دوستوں مسٹر ماتھر، مسٹر قریشی، مسٹر نقوی اور بیتاب صاحب کو اپنے گھر دعوت پر مدعو کیا۔ سب مزے لے لے کر چیزیں کھا رہے تھے۔ کہ احمد موسیٰ نے اپنی رفع حاجت کا واقعہ بیان کیا کہ کس طرح وہ اپنی پرانی موٹر میں دہلی کا سفر کرتا ہے اور رفع حاجت جیسے معمولی مسئلے سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ حیات اللہ انصاری نے بہ ظاہر بہت چھوٹے سے مسئلے کو نہایت اہم بنا کر پیش کیا ہے۔ یہ افسانہ نگار کا کمال ہے کہ وہ انتہائی باریک نقطے کو انتہائی چابک دستی سے بیان کرتا ہے کہ قاری کی دل چسپی کو ہوا ملتی ہے۔ ''انوکھی مصیبت'' کا اسلوب فکری ہے اور افسانہ نگار کے گہرے اور وسیع مشاہدے کا مظہر ہے۔ رفع حاجت انسان کی زندگی کا عام سا مسئلہ ہے جس سے ہر خاص و عام کو روزانہ واسطہ پڑتا ہے لیکن یہ معمولی سا مسئلہ بعض حالات میں انتہائی سنگین صورت حال اختیار کر لیتا ہے۔ وقار عظیم انوکھی مصیبت کے معمولی واقعے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''افسانہ نگار نے انوکھی مصیبت میں ایک معمولی اور بظاہر بھونڈے اور بھدے واقعہ کا ذکر کیا ہے لیکن اس ذکر سے کم از کم ایک بات ضرور ظاہر ہوجاتی ہے اور وہ یہ کہ انسان اگر زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی اور معمولی سے معمولی بات کو غور سے دیکھے اور اس کا تجزیہ کرے تو اس میں بھی فکر و خیال کے لیے ایسی ایسی۔۔۔ راہیں پیدا ہوتی ہیں جو خواہ خود تنگ و تاریک ہی ہوں، لیکن کسی اہم منزل کی طرف جانے میں یقیناً مدد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔'' (۱)

''ڈھائی سیر آٹا'' سماجی اور استحصالی رویوں پر مبنی افسانہ ہے جسے مارکسی افسانہ قرار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، حیات اللہ انصاری کے مارکسی رجحان کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''حیات اللہ انصاری کے افسانوں میں مارکسی رجحان نمایاں ہے جو زندگی کی دیگر قدروں کا تعین کرتا ہے، پھر یہ کہ معاشی رجحان کے عقب میں جنسی رجحان، حقیقت نگاری اور فطرت نگاری کے پہلو بھی دکھائی دیتے ہیں۔'' (۲)

اس مارکسی افسانہ میں معاشرے کے غریب، پست، لاچار اور بے بس طبقے کی نمایندگی کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح بے بس اور غریب طبقہ اپنی بھوک اور ضرورت کی خاطر اکرایا ہوا آٹا کھانے پر مجبور ہے۔ اس آٹے کو شوکت میاں، بیگم صاحبہ خیراتن اور فقیر نے ٹھکرا دیا یہاں تک کہ بکری نے بھی کھانے سے منہ موڑ لیا، عورت دو بچوں کے ہمراہ مانگنے کے لیے آئی تو خیراتن نے وہ تمام آٹا اسے دے دیا۔ اس عورت کو خیراتن کے خلوص پر شک ہوا اور اس نے آٹا دیکھا تو اکرایا ہوا تھا۔ وہ آٹا گلی میں چھوڑ گئی۔ سب کا ٹھکرایا ہوا آٹا مولا اور اس کا خانداں مزے لے کر کھاتا ہے۔ مولا گلی سے گزر رہا تھا کہ اس کی نظر ڈھائی سیر آٹے پر پڑی۔ آٹا دیکھ کر اس کا دل للچایا مگر لوگوں کے خوف سے اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی۔ لیکن وہ اس آٹے کو گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ بھوک سے بلکتے بیوی، بچوں کا خیال آتے ہی وہ پیچھے آنے والے مزدوروں کو نظر انداز کر دیتا ہے، اپنی عزت اور غیرت کو کچوکے دیتا ہے، انا اور خود داری کو پس پشت ڈال کر اپنے ضمیر کا خون کر کے، صرف بھوک کی خاطر وہ اکرایا ہوا آٹا اٹھا کر گھر لے جاتا ہے، جسے منی پکاتی ہے اور وہ سب مزے لے کر کھاتے ہیں۔

بھرے بازار میں بیانیہ افسانہ ہے۔ اس میں انسانی نفسیات کو پیش کیا گیا ہے۔ حیات اللہ انصاری نے افسانے کے فنی اور فکری لوازمات کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک عورت کی نفسیات کی خوب صورت عکاسی کی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید بھرے بازار میں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''بھرے بازار میں محدود وقت کا افسانہ ہے لیکن اس محدود وقت میں بھی حقیقت کشائی اس طرح کی گئی ہے کہ پورا معاشرتی عمل ہمارے سامنے موثر انداز میں آجاتا ہے اور افسانے کا سادہ بیانیہ اسلوب ایک ایسے حزینہ نغمے کو جنم دے ڈالتا ہے جو ٹوٹے ہوئے ستار کے تاروں سے مرتعش ہورہا ہے اور جس کی لپیٹ میں ''رکھی'' نہیں آتی بلکہ پورا معاشرہ آجاتا ہے۔''(۳)

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری اس حوالے سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''بھرے بازار میں حیات اللہ انصاری کا ایک اچھا افسانہ ہے۔ ایک عورت کی نفسیات کو حیات اللہ انصاری نے بڑی فن کارانہ مہارت سے پیش کیا ہے۔ حقیقت نگاری کا بھی ایک اچھا نمونہ ہے۔''(۴)

بھرے بازار میں کا مرکزی کردار رکھی نہانے کی نیت سے گھر سے نکلی تو اسے معاشرے کا بدنظری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہر فرد اسے شرافت کا لبادہ اوڑھے ہوئے گندی اور غلیظ نظروں سے دیکھتا ہے۔ مرد، عورتیں، بچے سب اس سے گھن کھاتے ہیں، اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ رکھی جب خود غرض اور بہ ظاہر شریف دکھائی دینے کی شرافت کو للکارتی ہے اور ان کی منافقت پر طمانچہ رسید کرتی ہے۔ ڈاکٹر حنیف فوق لکھتے ہیں:

> ''حیات اللہ انصاری کا افسانہ ''بھرے بازار میں'' سماج کے ایک قابل نفرت کردار کو ایک مجمع کے بیچ میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ سماج کی ساری گندگی نمایاں ہوجاتی ہے جسے دھونے کے لیے پارک کے تال کا پانی کافی نہیں۔ بیانیہ انداز میں لکھا ہوا یہ افسانہ کئی علامتی گوشے بھی رکھتا ہے۔ اس کا مطالعہ خارجی صورت حال کی سطح پر بھی کیا جاسکتا ہے۔''(۵)

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری ''رکھی'' کے نفسیاتی پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''حیات اللہ انصاری نے بڑی مہارت سے رکھی کے کردار کی نفسیات کی گرہیں کھولیں ہیں۔ اپنی بے عزتی کا بدلہ ''رکھی'' نے تال میں نہا کر کیا۔''(۶)

پرواز میں شیعہ، سنی فرقے کے تفرقات پر کاری ضرب لگائی گئی ہے۔ انھوں نے اس افسانے میں پرواز کے لیے پتنگ کی علامت استعمال کی ہے۔ جناب مولانا نے ایک پتنگ پر مدح صحابہ لکھ کر اڑادی۔ دوسری طرف قبلہ زادہ نے تبرا شریف لکھ کر پتنگ اڑادی اور مدحیہ پتنگ کو گھیر لیا۔ بچاری مدحیہ پتنگ کو مات ہوجاتی ہے۔ نوجوان شیعہ اور حضرت قبلہ خوشی مناتے ہیں جب کہ مولانا زادے کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ اسی اثنا میں سنیوں کا خون جوش مارتا ہے۔ وہ الانتقام اور الجہاد کا نعرہ بلند کرتے ہوئے مرحوم پتنگ پر افسوس کرتے ہیں اور مدحیہ پتنگ آسمان پر لہراتے ہیں۔ دوسری طرف قبلہ زادے نے المدد کا نعرہ لگایا اور آسماں پر سرخ، سبز اور سیاہ تبرائی پتنگ

لہرائی۔ تبرائی پتنگ کا کاٹنا ہر مسلمان پر فرض اور اس کا ثواب ایک حج کے برابر ہے۔ مدحیہ پتنگ کا کاٹنا ہر مومن پر فرض اور اس کا ثواب شہادت سے کم نہیں۔ ''پرواز'' طنزیہ کہانی ہے جس میں حیات اللہ انصاری نے فرقہ وارانہ تفریق کو اپنے مخصوص کاٹ دار اسلوب میں لکھا ہے۔ وقار عظیم، حیات اللہ انصاری کے افسانوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''حیات اللہ انصاری کا ہر افسانہ، چاہے وہ 'انوکھی مصیبت' کی طرح کا معمولی افسانہ ہو اور خواہ 'آخری کوشش' اور 'پرواز' کی طرح بلند، بامعنی اور لطیف، مشاہدہ کی باریک بینی کا مظہر ضرور ہے۔'' (۷)

آخری کوشش ایک لازوال بیانیہ افسانہ ہے۔ آخری کوشش کو حیات اللہ انصاری کی افسانہ نگاری میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ حیات اللہ انصاری کا شمار پریم چند کے ہم عصر افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ پریم چند نے ''کفن''، لکھ کر افسانہ نگاری کا حق ادا کیا اور حیات اللہ انصاری نے آخری کوشش لکھ کر۔ اگرچہ دونوں نے دیہات کے متوسط اور بالائی طبقے کی بھرپور نمایندگی کی ہے مگر بعض مواقع پر حیات اللہ انصاری، پریم چند پر سبقت لے جاتے ہیں۔ آخری کوشش اس کی نمایندہ مثال ہے:

''حیات اللہ انصاری کا ''آخری کوشش'' وہ افسانہ ہے جو اردو کے بہترین افسانوں میں شمار ہوتا ہے۔ پریم چند کی حقیقت نگاری، جس کے نتیجے میں ''کفن'' سے متاثر ہوکر ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھا گیا۔ ''آخری کوشش'' ایک کام یاب افسانہ ہے بل کہ یوں کہا جائے کہ ''آخری کوشش'' کئی پہلوؤں سے کفن سے زیادہ کامیاب افسانہ ہے، تو بے جا نہ ہوگا، حیات اللہ انصاری نے حقیقت نگاری بلکہ سفاک حقیقت نگاری کی ہے۔'' (۸)

ڈاکٹر ظل ہما ''آخری کوشش''، اور ''کفن'' کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''لیکن پریم چند اور آگے چل کر حیات اللہ انصاری دونوں کے یہاں حقیقت نگاری ہوتے ہوئے بھی حقیقت کا صرف وہ روپ ہے جو صرف ایک Idealism کے طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے۔ آخری کوشش اور کفن دونوں ایک ہی نوعیت کے افسانے ہیں اور دونوں کا رخ انتہا پسندی کی طرف ہے۔'' (۹)

''آخری کوشش'' کے کردار ''گھسیٹے'' اور اس کا بھائی ''فقیرا'' اپنی قریب المرگ ماں کو بھیک مانگنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ گھسیٹے، فقیرا کو گھر دے دیتا ہے، بکریاں دے دیتا ہے لیکن ماں جو اس کے لیے کمائی کا ذریعہ تھی۔ دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ جس پر فقیرا بگڑا جاتا ہے اور اسے یاد دلاتا ہے کہ برسوں اسے ماں کا خیال نہیں آیا اور اب جب ماں سے چار پیسے ملنے کی باری آئی تو ماں کی محبت عود کر آئی۔ اس بات پر دونوں میں خوب جھڑپ ہوتی ہے، دونوں ایک دوسرے پر حملہ کرتے ہیں، کبھی ماں ایک کے ہاتھ میں آتی ہے اور کبھی دوسرے کے۔ گھسیٹے، فقیرا پر چڑھتا ہے اور اس کا گلا گھوٹنے لگتا ہے۔ آخر فقیرا کا کام تمام ہو جاتا ہے تو وہ ماں کی طرف لوٹتا ہے۔ دیکھتا ہے کہ بھائی کے ساتھ ساتھ وہ ماں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا ہے اور اپنی بے سہارا زندگی پر ماتم کناں ہوتا ہے۔ ''آخری

کوشش'' حیات اللہ انصاری کا ایک کامیاب، بے لاگ اور سفاک حقیقت نگاری پر مبنی افسانہ ہے جسے ان کے شاہ کار افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر نگہت ریحانہ خان، ''آخری کوشش'' کی عظمت اور برتری کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> '' 'آخری کوشش' بیانیہ تکنیک میں لکھا گیا طویل افسانہ ہے لیکن اس کی عظمت اور گہرائی تاثر انگیز ہے۔اس میں تکنیک کے مناسب استعمال نے اور دل کشی پیدا کر دی ہے۔'' (۱۰)

آل احمد سرور ''آخری کوشش'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''حیات اللہ انصاری کی آخری کوشش اردو کے بہترین افسانوں میں شمار کی جاسکتی ہے۔'' (۱۱)

''ماں بیٹا'' فسادات پر مبنی افسانہ ہے۔حیات اللہ انصاری کے افسانوں میں تقسیم وطن کے زیرِ اثر تباہ کن معاشی ، سماجی اور تہذیبی صورت حال کا شعور ملتا ہے۔اس افسانے کے حوالے سے وقار عظیم لکھتے ہیں:

> ''حیات اللہ انصاری کے تین چار افسانوں میں سے 'ماں بیٹا' اور 'شکر گزار آنکھیں' پر تقسیم اور اس کے فوراً بعد کے غیر معمولی اثرات کا عکس اور ردِعمل نمایاں ہے لیکن تقسیم کے افسانوں پر جذباتی شدت کی جو گراں باری ہوتی ہے اس کے بجائے یہاں خاصا فنی اہتمام اور احتیاط ہے اور یہ خصوصیت حیات اللہ انصاری کے فن کے امتیازی صفت ہے۔'' (۱۲)

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، حیات اللہ انصاری کے افسانے ''ماں بیٹا'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''حیات اللہ انصاری کے دو افسانے ''ماں بیٹا'' اور ''شکر گزار آنکھیں'' فسادات میں پیش آنے والے فسادات کے حوالے سے متاثر کن ہیں۔''ماں بیٹا'' کا کینوس قدرے وسیع ہے اور اس مین یہ نکتہ پیدا کیا گیا ہے کہ زندگی اپنی تمام تر اذیتوں کے باوجود نہایت گراں مایہ شے ہے۔''(۱۳)

''ماں بیٹا'' کا بنیادی کردار ''مومنہ'' تین بچوں (مہرن ،شمس اور قمر) کی ماں ہے۔ وہ اپنے بچوں اور شوہر کو اپنی آنکھوں کے سامنے تڑپتا اور مرتا ہوا دیکھتی ہے لیکن بے بس اور لاچار کھڑی ان کی مدد کرنے سے قاصر ہے۔اپنی آنکھوں سے اپنے گھر کی تباہی و بربادی دیکھتی ہے لیکن خاموشی تماشائی بنی رہنے پر مجبور ہے۔اپنا سب کچھ کھو دینے کے بعد بھی وہ بے مقصد زندگی گزارنے پر مجبور ہے اور غیر مسلم رامو کی رفاقت اور قرب کو باعثِ تسکین سمجھتی ہے۔ اپنی ممتا کی پیاس اس سے بجھاتی ہے۔ راموا پنی ماں کو کھو دینے کے بعد منہ کو اپنی ماں تصور کرتا ہے۔ دونوں کے خاندان والے فسادات کی نذر ہوئے اور وہ اکیلے رہ گئے۔تنہا زندگی گزارتے ہوئے وہ ایک دوسرے کا سہارا بنتے ہیں۔ دونوں کے مذہب الگ ہیں۔کوئی خون کا رشتہ نہیں ہے۔لیکن دونوں کا دکھ ایک ہے جو ان دونوں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیتا ہے۔حیات اللہ انصاری نے اس طویل کہانی ''ماں بیٹا'' میں انسانی ہمدردی اور محبت کا درس دیا ہے۔

''چچا جان'' میں حیات اللہ انصاری کا اسلوب نگارش رحم دل اور انسانیت پرست ہے۔ چچا جان کو خدا ترس

اورغریبوں کے حاجی وناصر کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ چچا جان کسی کا بھی دکھ برداشت نہیں کر سکتے جس کسی کو تکلیف میں مبتلا دیکھتے، فوراً تلملا اٹھتے، اس کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتے اور اسے حل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے۔ چچا جان نے جہاں اور بہت سے اصلاحی کام کیے، وہاں ان کا ایک شان دار کارنامہ مہا کوسی ڈیم تھا۔ اس ڈیم کی تعمیر میں انھوں نے پانچ سال صرف کیے اور مہا کوسی ڈیم سے والہانہ محبت کے باعث وہاں دفن ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ چچا جان کی خواہش کے پیشِ نظر ان کو وہاں ہی دفن کیا گیا۔ راوی پندرہ برس بعد جب وہ ڈیم کے ٹوٹنے کی خبر اخبار میں پڑھتا ہے تو اسے اچانک چچا جان کا خیال آتا ہے۔ وہاں پہنچ کر کیا دیکھتا ہے کہ نہ تو وہاں مہا کوسی ڈیم ہے اور نہ ہی چچا جان کی قبر۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں:

''ان کا افسانہ ''چچا جان'' شعور کی رو کی تدبیر کاری کا شاہ کار ہے۔'' (۱۴)

''خلاص'' ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو فٹ پاتھ کی پیداوار تھی۔ اپنے ماں باپ کو نہ جانتی تھی۔ کسی خوانچے والے کی چوری کرتے پکڑی گئی اور خوب مار کھائی۔ اسی اثنا میں کسی صاحب نے اسے چھڑایا اور اپنے گھر لے جا کر اس سے گھر کا کام کروانے لگے۔ جب وہ صاحب بمبئی چھوڑ کر جانے لگے تو رمپریا اسٹیشن سے غائب ہوگئی۔ رمپریا محنتی اور رجفاکش خاتون تھی۔ وہ دن میں لوگوں کے گھروں میں کام کرتی اور شام میں کھلونے اور غبارے بیچتی یا پھر چاٹ کی دکان پر پکوڑے تلتی۔ رمپریا کی بات سمجھنا مشکل کام تھا۔ اس کے پاس بہ مشکل دو سو الفاظ تھے جن سے وہ اپنا مطلب نکالتی تھی۔ ''خلاص'' اس کا پسندیدہ لفظ تھا جس کے معانی کبھی خوشی کے ہوت اور کبھی غم کے۔ خلاص اس کی گفتگو میں اس قدر استعمال ہوتا تھا کہ ہر بات میں دس لفظوں کے بعد خلاص کا لفظ ضرور آتا۔ افسانہ نگار نے ''خلاص'' میں عورت کی قربانی سے متعارف کروایا ہے کہ کس طرح جاہل اور گنوار لڑکی نے اپنے شوہر کو بچانے کے لیے ڈرامائی یا فلمی کردار ادا کیا اور شوہر سے حقِ وفا ادا کیا۔ ڈاکٹر انوار احمد، ''خلاص'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تاہم ''خلاص'' ایک موثر کرداری افسانہ ہے، جس میں '''' آخری کوشش'' کی خالق کے چمک موجود ہے، نچلے طبقے کے کسی کردار کو 'آئیڈیلائز' کرنا خالص ترقی پسند انہ شیوہ ہے، جو فارمولے کا درجہ اختیار کر گیا تھا مگر اس افسانے کی خوبی محض یہی کچھ نہیں، بلکہ یہ ایک ایسی معمولی عورت رمپریا کی کہانی ہے، جو رفتہ رفتہ اپنے غیر معمولی اوصاف کو منکشف کرتی ہے، مگر بڑی سادگی اور فطری پن سے۔'' (۱۵)

''بے حد معمولی'' ایک فقیرنی کے بچے کی کہانی ہے۔ پروفیسر دارا اور پروفیسر منظور اپنی موڑ پر جا رہے تھے کہ سڑک پر ایک فقیرنی ان کی کار کے سامنے آ گئی۔ فقیرنی کو ہسپتال لے جایا گیا۔ فقیرنی کے ہمراہ اس کے بچے کو بھی ہسپتال لے جایا گیا۔ فقیرنی نے دم توڑ دیا۔ اس کا بچہ زندہ بچ گیا جس کو بچانے کے لیے پروفیسر دارا اور اس کی بیوی نشی نے دن رات ایک کر دیا۔ انھوں نے اپنے بچوں کو تو خود سے دور رکھا ہوا تھا لیکن فقیرنی کے بچے کی خوب تیمار داری کی اور اس کی صحت یابی کے لیے دعائیں کیں، روپیہ پیسہ خرچ کیا، یہاں تک کہ نشی زیور بیچنے پر راضی ہوجاتی ہے۔ جس زیور پر اس کی بیٹی کا حق تھا وہ فقیرنی کے بچے کے علاج پر خرچ کرنے پر آمادہ ہوجاتی ہے لیکن پروفیسر دارا کسی

سے قرض لے لیتے ہیں جس کا سود نشی ٹیوشن پڑھا کر ادا کرنے کی حامی بھر لیتی ہے۔ فقیرنی کے بچے کی خاطر ناپسندیدہ اور خلافِ طبیعت ٹیوشن قبول کر لیتی ہے۔ نشی کے اپنے تین بچے ہیں۔ نہ جانے پھر بھی کیوں فقیرنی کے بچے سے وہ اپنی ممتا کی تسکین کر رہی تھی۔ کسی قیمت پر اسے خود سے دور نہ کرتی۔ بچہ بھی ان سے خاصا مانوس ہو گیا تھا کہ ہر وقت نشی کے پاس رہتا۔ مشن والوں نے لینا چاہا تو نشی نے صاف انکار کرنے کے بجائے سوچنے کے لیے وقت مانگا۔ آخر میں پروفیسر دارا، نشی کو سمجھاتے ہیں کہ ''خداداد'' ایک فقیرنی کا بیٹا ہے لکن ہمیں اس سے اُنس اور محبت ہوگئی ہے۔ ایسی صورت میں یہی مکن ہے کہ ہم اسے اپنے بھتیجے یا بھانجے کی طرح سمجھیں اور اس کی پرورش کریں۔ ہمارے بچوں کا اپنا مقام ہوا اور اس کا اپنا۔ نشی اپنے شوہر کی اس بات سے اتفاق کرتی ہے۔

''سر بستہ راز'' حیات اللہ انصاری کا سادہ بیانیہ افسانہ ہے جس میں انھوں نے بستے کے راز کو افشا کیا ہے، وہ بستہ ''لالا جی'' اپنی بیوہ بیوی ''للتا'' کے لیے چھوڑ گئے تھے۔ درحقیقت للتا سے شادی کرلی تھی کہ لالا جی اپنی للتا کے لیے ایک بستہ چھوڑ گئے تھیکہ اس بستے میں موجود دولت سے کوئی دھرم شالہَ، مندر وَیا دھوا اشرم بنوا کر وہاں کی مینیجر بن جاتا اور اپنی باقی زندگی آرام وسکون سے گزارتا۔ اس بستے کے راز سے انھوں نے کسی کو بھی آگاہ نہ کیا۔ انھوں نے للتا کو صرف ''ستیش'' کو ہم راز بتانے کی تاکید کی جو ان کی نظر میں ایمان دار تھا۔ للتا نے اس سر بستہ راز میں ستیش کو ہم راز بنایا۔ ستیش نے بستہ کھول کر ایک فائل نکالی جس میں چھے سات مسلیں تھیں۔ ستیش نے ایک مسل کھول کر پڑھی تو اس میں ایک خط تھا جس میں ''راجا صاحب'' کے ٹیکس چودی کے سارے واقعے کو تفصیلاً بتایا تھا کہ راجا صاحب نے اس میں ایک لفظ ''راج پور'' کو بدل کر ''رام پور'' کر دیا تھا۔ یہ خط راجا صاحب کو دکھا کر ان سے ''پچاس ہزار'' وصول کی جاسکتے تھے۔ ستیش ایمان دار الالا جی کی اس حرکت پر افسوس کا اظہار کرتا۔ ستیش خود بھی ایمان دار لالا جی کی اس حرکت پر افسوس کا اظہار کرتا۔ ستیش کو دبھی ایمان دار شخص تھا لیکن ایک لمحے کے لیے وہ پچاس ہزار سے مکان بن سکتا ہے، کاروبار ہوسکتا ہے، بیوی کا اچھا علاج ار بچوں کے اچھے کپڑے اور جوتے خرید لے جاسکتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر لوگوں میں عزت حاصل کی جاسکتی ہے۔ ستیش وہ خط فائل سے پھاڑ دینے کی نیت سے نکال لایا تھا لیکن ضرورت زندگی نے اس کے ذہن کو مفلوج کر دیا ور اسے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اسے پھاڑ دوں یا پچاس ہزار لے کر خود رکھ لوں یا پھر ایمان داری سے رقم وصلو کر کے للتا کو دے دوں اور وہ دھرم شالہ یا مندر بنوا کر اپنی باقی زندگی آرام سے بسر کر لے۔

حیات اللہ انصاری نے اپنے افسانوں میں معاشرے کے پست اور بالائی طبقے کی تصویر کشی کی ے۔ دیہات کے مظلوم اور بے بس طبقے کے لیے ہمدردی کے جذبات کو ابھارا۔ ان کے افسانوں کے مطالعے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے فکر، تخیل اور مشاہدے کو باہم پیوست کر دیا ہے۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی بات کو نہایت باریک بینی سے دیکھتے اور پرکھتے ہیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، حیات اللہ انصاری کے افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''حیات اللہ انصاری عام طور پر اپنے افسانے زندگی کے نہایت معمولی پلاٹ کی بنیاد پر لکھتے ہیں لیکن ان معمولی واقعات کا جب باریک بینی سے مشاہدہ کیا جاتا ہے تو زندگی کے بعض اہم سربستہ اسرار ورموز کا انکشاف ہوتا ہے۔ یہ مشاہدہ اور باریک بینی حیات اللہ انصاری کے فن کا

نمونہ ہے۔'' (۱۶)

حیات اللہ انصاری کے افسانے سوچنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کے بیشتر افسانے غربت، درد، کرب اور گم کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ حیات اللہ انصاری نے کم زور اور غریب طبقہ کی مفلسی اور بھوک کو محسوس کیا ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے خود انھوں نے اس دکھ، درد، بھوک، پیاس، مجبور ار لاچار زندگی کا تجربہ کیا ہے درحقیقت یہ ب ان کی قوت مشاہدہ کی دین ہے کہ وہ ہر باریک نقطے میں گہرائی پیدا کر لیتے ہیں۔

---

## حوالہ جات


(۱) وقار عظیم، نیا افسانہ، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۵۷ء، ص ۱۱۴

(۲) سلیم آغالباش، ڈاکٹر، جدید اردو افسانے کے رجحانات، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۰ء، ص ۱۸۱

(۳) انور سدید، ڈاکٹر، ''حیات اللہ انصاری کے افسانے''، مشمولہ حیات الله انصاری کے بہترین افسانے از رفعت مالک، لاہور: چوہدری اکیڈمی، ۲۰۰۸ء، ص ۱۵

(۴) اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر، ترقی پسند اردو افسانہ اور چند اہم افسانہ نگر، نئی دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۲ء، ص ۹۸

(۵) حنیف فوق، ڈاکٹر، ترقی پسند افسانے، اسلام آباد: الحمد پبلشنگ، ۲۰۰۳ء، ص ۱۵

(۶) اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر، ترقی پسند افسانہ اور چند اہم افسانہ نگار، ص ۹۹

(۷) وقار عظیم، نیا افسانہ، ص ۱۱۴

(۸) اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر، ترقی پسند اردو افسانہ اور چند اہم افسانہ نگار، ص ۹۹-۱۰۰

(۹) ظل ہما، ڈاکٹر، دہلی میں اردو افسانہ (۱۹۰۰ء سے ۱۹۴۷ء)، نئی دہلی: شاہد پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء

(۱۰) نگہت ریحانہ فان، ڈاکٹر، اردو مختصر افسانہ: فنی و تکنیکی مطالعہ، لاہور: بک وائز، بار اول، ۱۹۸۸ء، ص ۹۷

(۱۱) آل احمد سرور، ''اردو میں افسانہ نگاری''، مشمولہ تنقیدی اشارے، لکھنؤ: ادارہ فروغ اردو، چوتھا ایڈیشن، ۱۹۶۴ء، ص ۴۵

(۱۲) مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، جدید اردو افسانے تک، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۴۰ء، ص ۲۴۱

(۱۳) سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، جدید اردو افسانے کے رجحانات، ص ۲۵۹، ۲۶۰

(۱۴) مرزاا حامد بیگ، ڈاکٹر، اردو افسانے کی روایت، اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۱۹۹۱ء، ص ۵۴

(۱۵) انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، کراچی: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۷ء، ص ۱۱۵

(۱۶) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، آج کا اردو ادب، کراچی: رہبر پبلشرز، اشاعت سوم، ۱۹۹۰ء، ص ۲۴۱